© rasailojaraid.com

مولانا علم الدین علیم ناصری رحمۃ اللہ علیہ

محمد رمضان یوسف سلفی

۱۹۸۸ء کے ابتدائی دنوں میں مجھے پہلی بار جماعتی زندگی میں آنے اور جماعت اہل حدیث کے رسائل و جرائد دیکھنے اور پڑھنے کے مواقع میسر آئے۔ آگے چل کر میرا یہ شوق بڑھتا ہی چلا گیا۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ میں گرمیوں کی تپتی دوپہر میں اپنے ذوق کی تسکین کیلئے امین پور بازار فیصل آباد میں مرکزی جامع مسجد اہل حدیث کے زیریں جامعہ سلفیہ کے ذیلی دفتر سے متصل شبان اہل حدیث کی لائبریری میں پہنچا اور وہاں بیٹھ کر جماعتی رسائل و جرائد کا مطالعہ کیا۔ اسی شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبھی ادارہ علوم اثریہ منٹگمری بازار فیصل آباد بھی چلا جاتا تھا اور مولانا ارشاد الحق اثری صاحب اور مولانا عبدالحئی انصاری صاحب کی شفقت و محبت سے وہاں بیٹھ کر بہت سے رسائل پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کتب و رسائل پڑھنے اور انہیں جمع کرنے کا روگ جسے ایک بار لگ جائے' پھر یہ عمر بھر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ خوش بختی سے میں اس ''روگ'' میں مبتلا ہوں۔ اللہ کے فضل و رحمت سے میرے ذاتی مطالعہ اور محنت سے اتنی استعداد پیدا ہوگئی کہ میں مضمون نگاری کے میدان میں آ کر کچھ نہ کچھ لکھنے لگا۔

میں نے باقاعدہ کسی کی شاگردی تو نہیں کی' لیکن تحریر و نگارش کے رموز واوقاف سمجھنے اور جاننے کیلئے جن لائق صد احترام بزرگوں کی تحریروں سے حظ وافر اٹھایا اور اپنے اسلوب نگارش کی اصلاح کی ان میں ذہبی دوراں عظیم مصنف و مورخ مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ اور شاعرِ توحید و سنت مولانا علم الدین علیم ناصری رحمۃ اللہ علیہ کے اسمائے گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ ان دونوں بزرگوں محترم بھٹی صاحب اور محترم ناصری صاحب کے نام اور کام سے آشنائی ۱۹۸۸ء کے ابتداء میں جماعتی رسائل سے ہوئی تھی۔ بھٹی صاحب کا دیدار تو ۲۳ مارچ ۱۹۹۳ء کو مولانا محمد اسحاق چیمہ مرحوم کی نماز جنازہ کے موقع پر ہو گیا تھا اور ان کی خدمت میں عقیدت سے سلام بھی عرض کر دیا تھا اور کچھ عرصہ بعد ان سے نیازمندانہ اور عقیدت مندانہ تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے جو اللہ کے فضل سے اب تلک قائم ہیں۔

لیکن ناصری صاحب کی زیارت ۱۹۹۶ء کے اکتوبر میں مینار پاکستان کے سائے تلے مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے زیر اہتمام آل پاکستان اہل حدیث کانفرنس کے موقع پر ہوئی۔ وہ مکتبہ سلفیہ کے بک سٹال پر بیٹھے تھے۔

گندم گوں رنگ' تیکھی ابھری ہوئی ناک' روشن پیشانی' چمکتی آنکھوں پر نظر کا چشمہ' پوری داڑھی' سر پر کپڑے کی ٹوپی' لمبا قد' منحنی سا بدن' پاؤں میں سیاہ رنگ کا جوتا' دیکھنے میں ان کا سراپا من کو بھاتا تھا۔ میں اس نابغہ عصر شخصیت سے غائبانہ طور پر متعارف تو تھا لیکن انہیں دیکھا نہ تھا۔ لہٰذا اسٹال پر کتابیں دیکھ کر چلا گیا' ویسے بھی وہ اسٹال کے اندر تھے اور میں باہر تھا۔ لیکن ان کا سراپا ذہن میں محفوظ رہا۔

۱۹۹۷ء کے جولائی' اگست کا مہینہ ہو گا کہ میں الاعتصام کے دفتر گیا۔ مجھے ''الاعتصام'' کا مولانا حنیف ندوی نمبر مطلوب تھا۔ میں جب دفتر میں داخل ہوا تو کونے میں ایک تخت پوش پر دو بزرگ بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ ایک صاحب کتابت کر رہے تھے۔ میں نے ان سب کی خدمت میں سلام عرض کیا اور اپنی مطلوبہ شے طلب کی۔ شاید میری زبان سے الاعتصام کے ندوی نمبر کے الفاظ بعد میں نکلے ہوں' ایک بزرگ جنہیں میں ۹'۱۰ ماہ پہلے مینار پاکستان کے سائے تلے آل پاکستان اہل حدیث کانفرنس کے موقع پر مکتبہ سلفیہ کے اسٹال پر دیکھ چکا تھا' بجلی کی سی تیزی سے اٹھے اور سامنے والے ریک سے ندوی نمبر اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ نہ میں نے ان کا نام پوچھا' نہ انہوں نے راقم سے کوئی سوال کیا۔ میں نے قیمت ادا کی اور واپس آ گیا۔ اس کے بعد میں کئی بار الاعتصام کے دفتر گیا' لیکن ناصری صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔

8 اکتوبر ۲۰۰۰ء کو جماعت غرباء اہل حدیث کی سالانہ صوبائی کانفرنس میں شرکت کیلئے مولانا محمد ادریس ہاشمی صاحب کے ہاں رچنا ٹاؤن پہنچا۔ رات پروگرام میں شریک رہا۔ اگلے روز محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے گزارش کی کہ میں مولانا علیم ناصری صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کا کوئی سامان کر دیجئے۔ چنانچہ ظہر کی نماز ہم نے الاعتصام کی لائبریری کے اوپر مسجد میں ادا کی اور پھر نیچے دفتر میں آ گئے۔ وہاں ناصری صاحب تشریف فرما تھے۔ وہ بڑی محبت اور شفقت سے ملے۔ مولانا اسحاق بھٹی صاحب نے تعارف کراتے ہوئے جب ان کو بتایا کہ یہ ہمارے دوست رمضان یوسف سلفی ہیں جو آپ کے رسالے الاعتصام میں شخصیات پر مضامین لکھتے ہیں تو ناصری صاحب بہت خوش ہوئے اور انہوں نے میرے مضامین اور اسلوب تحریر سے متعلق کچھ ایسے الفاظ کہے جسے میں نے اپنی حوصلہ افزائی پر محمول کیا۔ ساتھ ہی وہ فرمانے لگے سلفی صاحب میں تو آپ کے مضامین پڑھ کر سمجھتا تھا کہ کوئی بڑی عمر کا تجربہ کار مضمون نگار ہو گا۔ ''تسیں تے چنگے بھلے نوجوان او''

پھر انہوں نے اپنا واقعہ سنایا کہ جب شاہنامہ بالاکوٹ کی نظمیں الاعتصام میں شائع ہوتی تھیں۔ ایک بار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معروف عالم دین مولانا عبدالرحیم اشرف (متوفی ۱۹۹۶ء) الاعتصام کے دفتر تشریف لائے۔ جب ان سے میرا تعارف ہوا تو وہ بڑے حیران ہو کر کہنے لگے میں تو سمجھتا تھا ناصری صاحب کوئی نوجوان شاعر ہیں۔ جس کا نعتیہ کلام اور رزمیہ شاعری پڑھنے والوں کے خون کو گرما دیتی ہے۔ آپ تو اچھے بھلے بزرگ ہیں۔

یہ ایک یادگار ملاقات تھی۔ انہوں نے اپنی شرینی گفتار سے خوب محظوظ کیا اور خلوص ومحبت کے آبگینوں میں بھر کر پیار کی جو ''مے ناب'' پلائی تھی اس کا تاثر اب تلک قلب وذہن کو شادکام کئے ہوئے ہے۔ وہ بڑی دلچسپ شخصیت اور بڑے پیارے انسان تھے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی فرماتے اور اپنے تجربے کی بناء پر انہیں تحریر وتصانیف کے ''گر'' سکھایا کرتے تھے۔ آئندہ سطور میں ہم ناصری صاحب کی علمی وادبی زندگی کے چند گوشے نمایاں کرنے کی کوشش کریں گے۔

مولانا علم الدین علیم ناصری یکم ستمبر ۱۹۱۹ء کو بھراؤں نامی گاؤں میں نبی بخش ترکھان کے گھر پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں تقسیم سے پہلے تحصیل قصور ضلع لاہور کا حصہ تھا۔ ناصری صاحب نے سکول کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے باباویر سنگھ مڈل سکول سے حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں مڈل کا امتحان پاس کر کے قریبی شہر کے خالصہ ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ خالصہ سکول ہی میں انہوں نے انگریزی کے ساتھ گورمکھی پڑھی اور یہیں سے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ سکول میں سکھ گوروؤں کے جنم دن بڑی پابندی سے منائے جاتے تھے۔ اس دن جلوس نکلتے اور جلسے ہوتے۔ سکول میں طلباء سے شبد (مذہبی گیت) پڑھوائے جاتے۔ ناصری صاحب سے بھی گوروؤں سے متعلق پنجابی میں ایک نظم ضرور لکھوائی جاتی اور جلسے میں سنی بھی جاتی۔

میٹرک کے بعد ناصری صاحب فوج میں چلے گئے اور انہوں نے دوسری عالم گیر جنگ میں حصہ لیا۔ جن دنوں پاکستان معرض وجود میں آیا' ان دنوں ناصری صاحب جاپان میں تھے۔ ان کے والدین اور عزیز و اقارب بھراؤں سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور وہ جھبراں ضلع شیخوپورہ میں قیام پذیر ہوئے۔

ناصری صاحب دسمبر ۱۹۴۷ء میں جاپان سے واپس پاکستان آئے اور اپنے عزیز واقارب سے ملے' پھر کچھ عرصہ بعد یہ کشمیر کے محاذ پر چلے گئے اور آخر فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی۔

ناصری صاحب کی جس ماحول میں پرورش ہوئی تھی وہ انگریز کا دورِ حکومت تھا اور یہ خطہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ فوج میں بعض ہندوؤں اور سکھوں سے دوقومی نظریے پر ان کی گفتگو اور نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ ناصری صاحب آزادی کے حامی اور دوقومی نظریے کے قائل تھے۔ یہ ایک واقعہ بھی ہے اور لطیفہ بھی کہ ناصری صاحب نے ''لوٹے'' کو کس خوبصورتی سے استعمال کر کے ایک سکھ حوالدار کو لاجواب کیا۔

ناصری صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ دو قومی نظریہ ایک اچانک سامنے آجانے والا سیاسی سٹنٹ نہ تھا بلکہ یہ دونوں قوموں میں بالفعل جاری وساری تھا۔ ہمارے رہن سہن میں فرق تھا' مذہب میں فرق تھا اور ساتھ ساتھ کھانے پینے اور پہننے تک کے آداب مختلف تھے۔ برتنوں کا استعمال اور پسند الگ الگ تھی۔ پانی پینے کے کنوئیں علیحدہ تھے۔ زبان و بیان اور لب ولہجہ میں خاصہ فرق تھا۔ اس پر ایک واقعہ یاد آگیا جو زیادہ دلچسپ اور فیصلہ کن بھی ہے۔

میں اس وقت فوج میں تھا۔ حسن اتفاق سے برطانیہ کی طرف سے جاپان پر قبضہ کرنے والی فوج میں مجھے بھی جاپان جانے کا اتفاقاً موقع مل گیا۔ میں اپنی یونٹ کا ہیڈ کلرک تھا۔ ہمارا حوالدار میجر ایک سکھ تھا۔ جس کا نام کرم سنگھ تھا۔ ہمارے پڑوس میں آسٹریلیا کی ایک یونٹ تھی' جس کا ایک سارجنٹ مسٹر جو ہمارے کرم سنگھ کا گہرا دوست تھا۔ حوالدار میجر کرم سنگھ ایک متعصب کانگریسی تھا۔ تقسیم کے خلاف تھا' پاکستان کے سلسلے میں مسلمانوں پر خفیہ خفیہ پروپیگنڈا کے تیر چلایا کرتا۔

مجھے کسی نے بتایا کہ یہ اس قسم کی باتیں کیا کرتا ہے۔ اس کی رپورٹ کرنی چاہئے۔ میں نے اسے زیادہ وقت نہ دی۔ ایک دن میں اپنے ساتھیوں فاروق اور نذیر کے ہمراہ سرِ شام کینٹین میں گیا تو سامنے ایک میز پر کرم سنگھ مسٹر جو کو لئے بیٹھا تھا' ہمیں دیکھتے ہی دوڑتا ہوا آیا اور ہمیں اپنی میز پر لے گیا۔ مسٹر جو سے تعارف کروایا اور ساتھ ہی مسٹر جو سے کہنے لگا کہ آپ ان سے دریافت کریں کہ آیا' ہم ایک قوم ہیں یا نہیں۔ ہماری زبان وتہذیب وثقافت ایک ہے یا کہ نہیں......؟ مسٹر جو نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا کہ آپ کرم سنگھ سے پوچھئے کہ ان کے گھر میں لوٹا موجود ہے......؟ مسٹر جو نے حیرت سے پوچھا What is Lota (لوٹا کیا ہے)

میں نے کہا یہ تو کرم سنگھ ہی بتائیں گے۔ ادھر کرم سنگھ کا حال کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ ناچار اسے بتانا پڑا کہ یہ ایک ٹونٹی دار برتن ہے جو خالص مسلمانوں کے ہاں ہوتا ہے۔ ہم لوٹا نہیں رکھتے۔ ہمارے پاس گڑوی ہوتی ہے' یعنی بے ٹونٹی کا برتن۔ مسٹر جو نے کہا کہ آپ کے ہاں تو برتن کا استعمال ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ پھر دوسری باتوں کا کیا کہنا۔ اس پر کرم سنگھ خاصہ شرمندہ ہوا اور اس کا پروپیگنڈا بھی نرم پڑ گیا۔ (المنبر فیصل آباد۔ داستان ہجرت نمبر جلد ۲۸' جولائی ۱۹۸۳ء)

یہ بھی حقیقت ہے کہ ناصری صاحب نے جس لوٹے کو مناظرانہ ہتھیار کے طور پر ایک سکھ پر چلایا ۱۹۴۷ء کے اگست میں امرتسر میں اسی لوٹے کو مسلمانوں نے ''لوٹا بم'' کے طور ایک جنگی ہتھیار کے طور پر دشمن پر چلایا تھا۔

ناصری صاحب نے فوج کے بعد محکمہ ہیلتھ میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور وہ اس سے ۱۹۸۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے جو شعر وشاعری تقسیم ملک سے پہلے کی تھی وہ سب ۱۹۴۷ء میں ان کے دیگر کاغذات کے ساتھ بھراؤں میں ضائع ہو گئی تھی۔ پچاس کے عشرے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہوں نے دوبارہ طبع آزمائی شروع کی۔ اب ان کا ذوق بھی نکھر گیا تھا اور عقیدے کی اصلاح بھی ہوگئی تھی۔ اب وہ باقاعدگی سے مولانا عطاء اللہ حنیف رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات جمعہ میں شریک ہوتے۔ ان کی مجالس میں ان کے آگے دوزانوں ہو کر بیٹھتے اور علمی و عملی طور پر مستفید ہونے کی کوشش کرتے۔

۱۹۶۰ء میں انہوں نے عمل بالحدیث شروع کر دیا اور مسلک اہل حدیث پر عمل پیرا ہوگئے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف رحمۃ اللہ علیہ ناصری صاحب پر حد درجے شفقت فرمایا کرتے تھے۔ شاہ نامہ بالاکوٹ کے سلسلے میں انہیں مفید معلومات اور مشوروں سے نوازتے اور انہیں سیدین شہیدین اور ان کی تحریک جہاد سے متعلق تاریخی کتب بھی مطالعہ کیلئے دیتے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا عوامل تھے کہ ناصری صاحب کے دل میں شاہ نامہ بالاکوٹ لکھنے کا داعیہ ابھرا۔ اس کیلئے ہمیں شاہ نامہ بالاکوٹ کی جلد اول کو دیکھنا پڑے گا۔ اس کے صفحہ نمبر ۲۰ پر ناصری صاحب لکھتے ہیں کہ:

خالصہ مڈل سکول میں ہمارے گیانی جی ہمیں سکھ تاریخ سے اپنے بہادروں کے قصے اکثر سناتے۔ سکھوں کا مقابلہ چونکہ مغل سلطنت سے تھا' اس لئے ان کا مقابلہ مسلمان لشکروں سے ہوتا۔ گیانی جی ہمیں جو کہانیاں سناتے' ان میں سکھ بہادروں کا پلہ ہمیشہ بھاری دکھاتے۔ میں اگرچہ اپنی اسلامی تاریخ و روایات سے نابلد تھا' مگر دل میں ایک کسک ضرور رہتی تھی کہ آخر ہندوستان میں مسلمان اتنے کمزور کیوں تھے۔ (حالانکہ اس کے باوجود حاکم وہی تھے۔)

ہندو' سکھ اور انگریز کی ملی بھگت سے جو تاریخ ہمیں پڑھائی جاتی تھی اس میں مسلمان بادشاہوں کو عموماً عیش پسند' کاہل اور ظالم ظاہر کیا جاتا تھا۔ فاضل اردو کے کورس میں شیخ اکرام مرحوم کی کتاب ''موج کوثر'' پڑھی تو تحریک جہاد نے بہت متاثر کیا' جو اس سے پہلے میرے مطالعے میں نہ آئی تھی۔ مڈل سکول کے زمانے میں جو کسک دل میں پیدا ہوئی تھی' اس کا مداوئی اس تحریک کے مطالعہ سے ہوا۔ اس کے علاوہ دینی عقائد کے سلسلے میں جو روایتی عقیدے چلے آ رہے تھے' ان میں تزلزل پیدا ہوا۔ تاریخ اسلام اور قرآن و حدیث کا جب غور سے مطالعہ کیا تو اپنے آپ کو اسلام کی بنیادی تعلیم سے کوسوں دور پایا۔

یہ مئی ۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے کہ میں نے باقاعدہ توحید و سنت پر عمل شروع کیا اور ساتھ ہی تحریک جہاد کو نظم کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ سب سے پہلے مرزا حیرت دہلوی کی کتاب حیات طیبہ خریدی اور ''شاہ نامہ بالاکوٹ'' لکھنے کا آغاز کر دیا۔

بلاشبہ ناصری صاحب کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر اہل حدیث نقطہ نگاہ سے پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل چار حصوں اور دو جلدوں میں ''شاہنامہ بالاکوٹ'' کے نام سے جہادی مثنوی لکھی اور اہل ذوق سے داد و تحسین حاصل کی۔ شاہ نامہ بالاکوٹ کے مقدمے میں برصغیر کے نامور مصنف' محقق اور ادیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی المعروف علی میاں ان الفاظ میں ناصری صاحب کے اس کارنامے کی تحسین فرماتے ہیں کہ ''شعر کے ذریعے دین و ملت کی یہ سعادت اب پاکستان کے مشہور شاعر جناب علیم ناصری کے حصے میں آئی ہے اور انہوں نے مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کے ماضی قریب کی تحریک اصلاح و جہاد کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ جو حضرت سید احمد شہید اور مولانا محمد اسماعیل شہید اور جماعت مجاہدین کے ذریعے قائم ہوئی اور جس کے دوررس اثرات آج بھی قائم و برقرار ہیں۔ حفیظ صاحب کا موضوع مقدس اور اہم ترین تھا۔ اس میں تخیل و جولانی و بلند پروازی کیلئے وسیع میدان تھا۔ اس کے مقابلے میں علیم ناصری صاحب کا موضوع محدود تھا اور اظہار جذبات میں حد ادب ملحوظ رکھنا تھا۔ تاہم فنی آداب کی رعایت اور شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے وہ حفیظ صاحب کے جانشین کہلانے کے مستحق ہیں۔ علیم صاحب کے یہاں زبان و بیان میں بڑی سادگی و شگفتگی' طرز ادا میں دلکشی و دلکشائی' تاریخی واقعات کا تسلسل اور جزئیات کا احاطہ' مزاج کی اسلامیت اور دینی غیرت و حمیت' اپنے موضوع کے ساتھ خلوص و تعلق خاطر بلکہ جذباتی لگاؤ اور فن کے ظاہری و معنوی محاسن کی موجودگی نے ان کے ''شاہ نامہ بالاکوٹ'' میں عصر حاضر کے ایک اچھے اسلامی رزمیہ کی شان پیدا کر دی ہے۔ جس کو پڑھتے ہوئے آنکھیں بھی نم ہوتی ہیں اور دلوں میں حرکت و حرارت بھی محسوس ہوتی ہے اور یہ کسی ادبی شاہکار کی کامیابی کی ایک بڑی دلیل اور کھلا ثبوت ہے۔''

ہمیں امید ہے ان کا شاہ نامہ حفیظ مرحوم کے شاہ نامے کی طرح عرصے تک دلوں کو گرمانے' اسلامی جذبات اور ایمانی احساسات کی ترقی' دینی غیرت و حمیت میں اضافہ اور ملی زندگی میں حرکت و حرارت کیلئے مہمیز ثابت ہوگا اور ان کی محنت ٹھکانے لگے گی اور عنداللہ بھی وہ ماجور ہوں گے۔ ﴿ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین﴾

ناصری صاحب اونچے مقام و مرتبے کے شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان کی شاعری میں عقیدہ و فکر کی پختگی اور سیرت و اخلاق کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ شعر و ادب سے انہیں فطری لگاؤ تھا۔ زبان کے قواعد و ضوابط اور شعر و سخن کے معائب و محاسن سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ فطری شاعر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے پناہ علمی و ادبی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ اپنی شاعری کے متعلق شاہ نامہ بالاکوٹ میں لکھتے ہیں:

''شاعری میں مجھے الحمدللہ تلمیذ الرحمان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ہائی سکول میں اردو فارسی کے ہمارے استاد مولانا سراج الدین ایمن خود بھی ایک نغز گو شاعر تھے۔ وہ میری نظموں کی اصلاح فرمایا کرتے۔ مگر مجھے عروض کی کوئی تعلیم انہوں نے نہیں دی اوزان و بحور سے مجھے فطرتی مناسبت تھی' اس لئے اپنی علمی استعداد کے مطابق میں اردو شاعری میں رواں دواں رہا۔''

ناصری صاحب نے نثر سے زیادہ نظم میں لکھا۔ ان کی رزمیہ شاعری کی طرح ان کا نعتیہ کلام بھی بہت عمدہ ہے۔ ''طلع البدر علینا'' ان کی عمدہ نعتیہ شاعری ہے اس پر ۲۰۰۰ء میں انہیں صدارتی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ اس کے متعلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حافظ صلاح الدین یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ

''علیم ناصری صاحب کا نعتیہ کلام جو ﴿طلع البدر علینا﴾ کے نام سے چھپا ہے' بلاشبہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ اور ذات رسالت مآب ﷺ سے بے پناہ عقیدت کا ترجمان ہے۔ جسے اونچے سے اونچے نعتیہ کلام کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس میں ایک طرف عظمت وشان مصطفیٰ ﷺ کا اقرار و اعتراف ہے' دوسری طرف عقیدت و محبت اور والہانہ شفتگی کا اس انداز سے اظہار ہے کہ کہیں بھی توحید کے تقاضے مجروح نہ ہوں۔ ایک عظیم کارنامہ ہے۔''

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ ناصری صاحب کے بیٹے خالد علیم کو بھی کچھ عرصے پہلے شعر گوئی اور نعتیہ کلام کے سلسلے میں صدر پاکستان کی طرف سے ''صدارتی ایوارڈ'' مل چکا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور ہو زیادہ۔

ناصری صاحب کا ایک مجموعہ کلام ہے ''بدرنامہ'' اس میں جنگ بدر اور اس کے شہداء کے احوال نظم کئے گئے ہیں۔ ''احدنامہ'' زیر ترتیب تھا' جو مکمل نہ ہوسکا' جبکہ انہوں نے اربعین (چالیس احادیث) کو بھی اشعار میں ڈھال دیا تھا۔ ان کی ایک کتاب ہے ''متاع دیدہ ودل'' اسے تعزیتی نظموں کا مجموعہ کہنا چاہئے۔ جو انہوں نے مختلف ائمہ کرام' علماء عظام اور اپنے بعض اعزہ واقارب کی وفات پر لکھیں۔ یہ کتاب مولانا اسحاق بھٹی صاحب کے مقدمے سے مکتبہ قدوسیہ لاہور نے شائع کی۔ ناصری صاحب بہت بڑے انشاء پرداز' شاعر' ادیب' نقاد اور تبصرہ نگار تھے۔ زبان وقلم پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ ۸۱-۱۹۸۰ء میں وہ ہفت روزہ اہلحدیث کی مجلس ادارت سے منسلک رہے۔ پھر مولانا عطاء اللہ حنیف رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر الاعتصام سے تعلق جوڑ لیا اور بقیہ تمام عمر اسی کے ساتھ گزار دی۔ آپ ہفت روزہ الاعتصام کے مختلف ادوار میں ایڈیٹر رہے اور اب بھی وہ اس کی مجلس ادارت کے رکن تھے۔

انگریزی' فارسی [illegible] زبان میں انہیں کامل آگاہی اور دستگاہ حاصل تھی۔ الاعتصام میں ان کا [illegible] ''زبان خامہ کی خامیاں' جہاں الفاظ کی صحت اور زبان کی درستی و ادائیگی سے آگاہی دیتا تھا' وہیں یہ مضمون نئے لکھاریوں کیلئے بھی بہت مفید تھا۔ ناصری صاحب کے کتابوں پر تبصرے بھی بڑے جاندار ہوا کرتے تھے۔ وہ بڑی باریک بینی سے کتاب کا مطالعہ فرماتے۔ تبصرہ لکھتے وقت سنین کی اغلاط بتاتے' تسامحات کی نشان دہی کرتے اور عبارات کی اصلاح کے ساتھ صحیح معلومات بھی فراہم کرتے تھے۔

ان کا تازہ کلام اکثر الاعتصام کے صفحات کی زینت بنتا۔ اداریہ بہت عمدہ لکھتے اور شخصیات سے متعلق اپنے تاثرات خوبصورت پیرائے میں احاطہ تحریر میں لاتے۔ ایک عرصہ تک روزنامہ جرات میں یومیہ قطعہ لکھتے رہے' اب روزنامہ انصاف اور ہفت روزہ غزوہ میں تازہ قطعات لکھتے تھے۔ وہ بڑے مرنجا مرنج' باغ و بہار اور شگفتہ مزاج کے انسان تھے۔ دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار تھے۔ ان کا قلمی نام ''علیم ناصری'' اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ اس نے علم الدین کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب نے اس سلسلے میں ''متاع دیدہ ودل'' کے ''حرفے چند'' میں لکھا ہے کہ اب اسے کوئی گھر کا پرانا بھیدی ہی تلاش کرسکتا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے اپنا شعر سنایا تھا

شعر کہتا ہے علیم ناصری
اور علم الدین پینشن خوار ہے

افسوس گلستان رسالت ﷺ کا یہ بلبلِ ہزار داستان کچھ عرصہ بستر علالت پر رہ کر زندگی کی ۸۶ بہاریں اور ۱۲۲ دن گزار کر اس دنیا سے منہ موڑ کر فردوس کو روانہ ہوا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

انہیں کے دو اشعار پر اپنی معروضات کا اختتام کرتا ہوں۔ ناصری صاحب فرماتے ہیں ؎

اور کچھ نہیں ہے میرے دامن میں علیم
ہیں یہی دو چار نعتیں باقیات الصالحات
نادم ہے علیم اپنے گناہوں پہ خدایا
کر رحم یہ نغمہ سرا تیرے لئے ہے

بقیہ: بالاکوٹ میں تین روز

عہدیداروں کی جانفشانی اور دینی حمیت کو سراہا اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یاد رکھیں ہم یہ انسانی ہمدردی کا کام کسی بھی سیاسی لالچی اور دنیاوی تشہیر اور مفاد سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف اللہ رب کریم کی خوشنودی اور مسلمان بھائیوں کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے ہوئے کر رہے ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے نہ کہ کسی پر احسان۔ انہوں نے مزید کہا کہ مرکزی جمعیت اہل حدیث ایک فطری خالص دینی روایات اور عقائد کی حامل ایک فعال سیاسی اور مذہبی تنظیم ہے کہ جس میں آپ کو دین و دنیا کے حسین امتزاج دیکھنے کو ملے گا۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث خالصتاً ایک نظریاتی اور جہادی فکر کی امین تحریک ہے جو ہر وقت انسانوں کی خدمت' پاکیزہ' جمہوریت اور آزادی کیلئے میدان عمل میں برسرپیکار ہے اور رہے گی کہ جب تک انسانیت کو اس کی ضرورت ہے۔ ان شاءاللہ۔

آخر میں انہوں نے تنظیم کے عہدیداروں' کارکنوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں مزید جذبے سے سرشار کر اس وقت تک مصروف عمل رہنے کو کہا کہ جب تک تباہی و بربادی کی جگہ ہنستی بستی بستیاں نہ بس جائیں اور پژمردہ چہرے خوشی اور اطمینان سے نہ مہک اٹھیں۔

انہوں نے بیرون ملک مقیم اپنے ساتھیوں اور مخیّر حضرات کا شکریہ ادا کیا کہ جن کے خصوصی تعاون کی بدولت اتنے بڑے منصوبوں پر کام جاری ہے۔ خصوصاً سعودی عرب' قطر' متحدہ عرب امارات' ترکی' برطانیہ' امریکہ دیگر یورپی ممالک میں مقیم جماعت کے مخیّر حضرات کا کہ جنہوں نے ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان کی طرف اپنے مکمل تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ نیز مقامی مخیّر حضرات کو بھی خراج تحسین پیش کیا کہ آپ تو میرے قریب تر' میرے تن و جسم میں خوشبو کی طرح سے بسے ہوئے ہو۔

اللہ رب کریم ہماری اس چھوٹی سی کوشش اور کارکنوں کے جذبوں کو قبول فرمائے۔

© rasailojaraid.com